ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.5 No.2 2022

ترجمے کا فن اور ڈاکٹر جمیل جالبی کی ترجمہ نگاری

(جانورستان کے خصوصی حوالے سے)

THE ART OF TRANSLATION AND THE RENDERINGS OF DR. JAMIL JALBI (WITH SPECIAL REFERENCE OF JANWARASTAN)

***فوزیہ شہزادی**

پی ایچ۔ڈی اُردو (سکالر)، شعبۂ اُردو

گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

****ڈاکٹر محمد امجد عابد**

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور

*****پروفیسر ڈاکٹر محمد آصف اعوان**

شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

******ڈاکٹر قربان علی**

لیکچرر، شعبہ اردو، گورنمنٹ اسلامیہ گریجوایٹ کالج، سول لائنز لاہور

Abstract:

Translation and discourse analysis are the best sources of uniformity and conformity among societies and civilizations regarding meanings, ideologies, concepts and beliefs. Dr. Jamil Jalbi transforms from English language to Urdu aphoristically with same sense of meaning and context. The Researcher has critically evaluated translation of George Orwell's novel "Animal Farm" in Urdu Language entitled "Janwarstan" by Dr. Jamil Jalbi where idioms, phrases, phrasal verbs and slangs have been transformed as Lingua Franca. The reader feels originality that is real sense of Dr. Jamil Jalbi. A sociological system allegorically has been revealed by the author and conveyed the 2nd language with contextual aspect of civilization. Political differences how run among societies are real theme and how the misuse of power handles the situations.

کلیدی الفاظ: ترجمہ، زبان، مسائل، عصری شعور، ڈاکٹر جمیل جالبی، جانورستان، اینیمل فارم، جارج آرول

Key Words: Translation, Language, Issues, Contemporary Consciousness, Dr. Jamil Jalbi, Janwarastan, Animal Farm, George Orwell

عصرِ حاضر میں ترجمہ ایک اہم ادبی ضرورت بن چکا ہے کیونکہ اس کی بدولت ایک طرف تو دو قوموں کی تہذیب و تمدن ایک دوسرے میں مدغم ہو چکی ہے۔ تو دوسری جانب فکر و خیال، علم و ادب اور جذبات و احساسات کی منتقلی بھی عمل میں آئی ہے۔ غیر ملکی ادب تک رسائی کیلئے ترجمے کا کردار لائق تحسین ہے۔ کالی داس، عمر خیام، اقبال، ارسطو، افلاطون، سقراط اور دیگر ادیبوں کی فلسفیانہ سوچ پوری دنیا میں پہنچانے کیلئے ترجمے کا سہارا لیا گیا ہے۔ اس لیے آج زبان کی ترقی میں ترجمہ پیش پیش ہے۔ وہ ادب جو وقت کی گرد میں پس پشت ڈال دیا گیا تھا ترجمے نے اسے ایک نئی جلا بخشی ہے۔ ترجمے کی تفہیم کے لیے مختلف لغات میں درج تعریفات کچھ اس طرح سے ہیں:

فرہنگ آصفیہ میں ترجمے کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

"ایک زبان سے دوسری زبان میں بیان کیا ہوا۔"(۱)

نور اللغات میں ترجمے معنی یہ درج ہیں:

"ایک زبان کی لغت کو دوسری زبان میں کرنا۔"(۲)

علمی اردو لغت میں ترجمے سے مراد ہے:

"ترجمہ (ع۔ مذکر) ا۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں بیان کی گئی عبارت۔ ۲۔ کسی کی زندگی کا مرقع یا خاکہ۔"(۳)

ڈکشنری آف لٹریری ٹرمز میں ترجمہ کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

> "Despite the truth of the Italian aphorism, traduttare traditor. There have been many Praiseworthy and Successful (and, in some cases, superlatives) translation across a large tnogues into English…am attempt to Convey the Spirit, senses and style of the original by finding equivalents in syntax, grammar and idiom…a fairly free adaption which retains the original Spirit." (۴)

ترجمے میں لفظ کی بجائے خیال کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ لفظ کی تبدیلی میں وہ جاذبیت نظر نہیں آتی جو خیالات کے ردوبدل میں موجود ہے۔ اگر خیال دوسری زبان میں صحیح طرح منتقل ہو جائے تو ایسی تصنیف پر اصلیت کا گمان گزرتا ہے۔ حاجی احمد فخری اپنے ایک مضمون میں ترجمے کی تعریف سے متعلق یوں رقمطراز ہیں:

"ہمارے نزدیک ترجمے کی تعریف یہ ہے کہ کسی مصنف کے خیالات کو لیا جائے، ان کو اپنی زبان کا لباس پہنایا جائے، ان کو اپنے الفاظ و محاورات کے سانچے میں ڈھالا جائے اور قوم کے سامنے اس انداز سے پیش کیا جائے کہ ترجمے اور تالیف میں کچھ فرق معلوم نہ ہو۔"(۵)

درج بالا تعریف سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ترجمے میں خیالات کی پابندی اہم گردانی جاتی ہے۔ لہذا اسلوب بیان کی تقلید سے مترجم مبرا ہو جاتا ہے مگر حقیقت میں دیکھا جائے تو خیالات کی کارچندی ایک مشکل امر ہے۔ ترجمے کے جواز کا تذکرہ کیا جائے تو عموماً چار وجوہات ایسی سامنے آتی ہیں جن کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ترجمے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ان میں سب سے پہلے مذہبی تقاضے سرفہرست ہیں چنانچہ قرآن مجید کے ترجمے کا مقصد عام آدمی تک اللہ تعالی کا پیغام پہنچانا تھا۔ اس سلسلے میں شاہ عبدالقادر کا ترجمہ "بارش کا پہلا قطرہ" ثابت ہوا۔ علاوہ ازیں عیسائی مشزی مذہبی پرچار کے لیے ترجمے سے مدد لے رہے تھے۔ ترجمے کا دوسرا جواز عالمی ادب سے واقفیت قرار دیا جاتا ہے کیونکہ مشرق اور مغرب میں علم کا تبادلہ ترجمے ہی کی مرہون منت ہے۔ ترجمے کا تیسرا جواز حریت کے حصار کو توڑنے سے عبارت رکھتا ہے کیونکہ ایسے دور میں جب ہر طرف پابندیوں کا دور دورہ ہوتا ہے تو ترجمہ علامتی پیرائے میں باغیانہ لہجے کی عکاسی کرتا ہے۔ چوتھا جواز ایک تہذیب سے دوسری تہذیب کی روشناسی قرار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر رابعہ سرفراز اس حوالے سے یوں لکھتی ہیں:

"ترجمہ کا ایک رخ دوسری تہذیب کو متعارف کروانا ہے جبکہ دوسرا پہلو ہمیں دوسری تہذیب تک لے جاتا ہے۔"(۶)

ترجمے کی ضرورت اور جواز میں تخلیقی عمل کی سست روی اور نظریات کی فرسودگی بھی مہمیز لگاتی ہے۔ یعنی جب اپنے ملک کے ادب میں جاذبیت نہ رہے تو دوسرے ملک کے ادب کا ذائقہ چکھا جاتا ہے اور ایسا صرف ترجمے کی ہی بدولت ممکن ہوتا ہے۔ لہذا ترجمے کی ضرورت نہ صرف ادب کے میدانوں تک محدود ہے بلکہ دیگر شعبہ ہائے زندگی میں ترجمے کی بدولت مختلف تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر رابعہ سرفراز ترجمے کی ضرورت سے متعلق یوں رقمطراز ہیں:

"جدید زمانے میں ترجمہ نگاری کے فن اور اس سے وابستہ اسالیب کے آفاق بہت پھیل گئے ہیں۔ تجارت اور صارفین کی ضرورت نے ترجمے کی بہت ساری شکلوں کو معاش کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ نئی بدلتی ہوئی صورتحال سے یہ فن روز بروز اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ آج کی دنیا جسے گلوبل ولیج کی حیثیت حاصل ہے اپنے تعارف اور ابلاغ کے لیے ترجمے ہی کی مرہون منت ہے۔"(۷)

ترجمے کی بدولت زبان ہمیشہ پھیلتی رہتی ہے۔ مزید اس میں خوبیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ ترجمہ انسانی علوم کی ترقی میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ذہنی سرحدوں کی کشادگی، تمدنی اور ثقافتی ضرورتوں کے لیے بھی ترجمے پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ ترجمہ اپنی ضرورت کی بدولت اہمیت کا حامل بن چکا ہے۔ دونوں زبانوں کے تصرف میں ترجمہ کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ پروفیسر جیلانی کامران ترجمہ کی اہمیت سے متعلق یوں رقمطراز ہیں:

"ترجمہ اصل میں دو زبانوں اور دو تہذیبوں کے درمیان پل کا کام دیتا ہے۔ جس کے ذریعے خیالات اور تصورات ایک تہذیب سے دوسری کی طرف اور ایک ملک سے دوسرے ملک کی جانب جاتے ہیں۔"(۸)

ترجمہ نگاری ایک مشکل فن ہے۔ اس کے لئے زبانوں سے واقفیت کے علاوہ مہارتِ تامہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ترجمے کی اہمیت ہر روز بڑھتی جا رہی ہے۔ ذرائع ابلاغ کی ترقی کے ساتھ ساتھ ترجمہ بھی لوگوں کو ایک دوسرے کے نزدیک لا رہا ہے۔ جہاں تک علم اور سائنسی ایجادات کا تعلق ہے تو ترجمہ نے اس سلسلے میں مشعل کا کردار ادا کیا ہے۔ شہباز حسین ترجمہ کی اہمیت سے متعلق یوں لکھتے ہیں:

"علم کی وسعت اور علمی اور سائنسی دریافتوں کی کثرت سے بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچانے میں ترجموں نے بڑی مدد کی ہے۔ یورپ کے نشاۃ ثانیہ میں عربی کے تراجم کا بھی ہاتھ ہے۔ ترجمہ وہ کنجی ہے جس کے ذریعے علوم وفنون کے خزانے سب کے لئے کھل جاتے ہیں۔ اس لئے روز بروز ترجموں کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے اور ترجمے نے بھی تخلیق کا درجہ پا لیا ہے۔"(۹)

ترجمے کی اہمیت اس وقت اور بھی آشکار ہوتی ہے جب ایک تصنف آپ کو از سر نو تخلیق کی صورت میں ملتی ہے۔ ایک قوم کی ترقی کا انحصار افکار، نظریات اور خیالات پر مبنی ہوتا ہے۔ لہذا ترجمہ کی بدولت یہ تمام افکار دوسری زبان میں داخل ہو جاتے ہیں۔ پوری دنیا میں جس طرح ٹیکنالوجی، مشینری اور دیگر اشیاء کے تبادلے ہوتے رہتے ہیں اسی طرح ترجمے کے ذریعے علمی اور ادبی سرگرمیوں میں انقلاب برپا ہو سکتا ہے۔ ترجمے کی اہمیت سے متعلق خالد اقبال یوں رقمطراز ہیں:

"آج Global Village Age میں ترجمے کی توسط سے ہی جدید علوم وفنون، سائنس، طب اور ٹیکنالوجی کے علاوہ بہت سے نئے تصورات اور خیالات کو سمجھنے، دنیا کے مختلف خطوں میں بسنے والی اقوام اور ان کے مختلف زبانوں کے قریب لانے میں ترجمے کا کردار لازم اور حیثیت کلیدی ہے۔ اقوام عالم میں زبان علم وادب، ابتدا ہی سے مشترکہ سرمایہ تصور کیے جاتے رہے ہیں۔ اس لیے سرمائے کو وسعت دینے اور کسی بھی زبان کی تفہیم وتشریح کے لیے ترجمہ بنیادی اساس ہے۔"(۱۰)

بادی النظر ترجمہ کا آغاز اگرچہ مذہبی نشر واشاعت کے طور پر شروع ہوا مگر رفتہ رفتہ اس کا دائرہ کار دنیا کے تمام شعبہ جات میں سرایت کر گیا۔ جب لوگوں میں میل جول کا احساس بیدار ہوا تو ترجمے نے انہیں ایک دوسرے کے نزدیک کر دیا۔ اور یوں وہ مقامی تہذیب کے علاوہ عالمی تہذیب سے روشناس ہوئے۔ ترجمے ہی کے ذریعے لوگوں نے معاشی، طبّی اور صحافتی میدان میں ترقی کا علم بلند کیا۔ ٹیکنالوجی کے شعبے میں چوں کہ زبان سے نابلدی بڑی رکاوٹ بن چکی تھی۔ مگر ترجمے نے اس رکاوٹ کا بھی خاتمہ کر دیا۔ وہ ہدایات اور طریقہ استعمال جو مختلف زبانوں کے مراسلوں اور پمفلٹوں میں درج تھیں ترجمے کی بدولت وہ ہر زبان میں داخل ہو گئیں۔ لہذا ترجمے کی ضرورت واہمیت سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا۔ البتہ ایک کامیاب مترجم کیلئے اصولوں کی پابندی لازم تصور ہوتی ہے۔ چناں چہ ایک مترجم کا مطالعہ بہت زیادہ ہونا چاہیئے تب ہی وہ صحیح ترجمہ کر سکے گا۔ ترجمے کے اصولوں میں ترجمے کا صحیح ہونا سب سے سرفہرست ہے۔ ترجمے کا دوسرا اصول عام فہم ہونا ہے۔ تیسرا اصول خوبصورت ہونا ہے۔ حالانکہ یہ شرط جمالیات کے بالکل قریب پہنچ جاتی ہے۔ مترجم بعض اوقات اس اصول میں الجھاؤ اور گرانی کا شکار بھی ہوتا ہے۔ جس سے اظہار اور تفہیم کا عمل بھی متاثر ہوتا ہے۔ ان تینوں اصولوں کے علاوہ ترجمے میں اصطلاح کیلئے مترادفات اہم مانی جاتی ہیں۔ جو مترجم بہتر الفاظ استعمال کرتا ہے وہی کامیاب مترجم بنتا ہے۔ تراجم کے اہم اصولوں میں حتی الامکاں تحت اللفظ کی پابندی ہونی چاہیئے۔ تاکہ اصل عبارت خلاصے سے بچ جائے۔ نیز ترجمے کی زبان محاوروں سے مطابقت رکھتی ہو تب ہی ترجمہ ادبی تصویر پیش کرے گا۔ ترجمے کا اہم اصول نامانوس مترادفات کی کھوج لگانا بھی ہے۔ تاکہ ترجمہ ہر لحاظ

سے جاندار بن جائے۔ تراجم کے اصولوں میں فقروں کی طوالت بھی قارئین کو کھٹکتی رہتی ہے۔ لہذا اس سلسلے میں یہ خیال رکھا جائے کہ جملے سادہ اور مختصر ہوں تاکہ قارئین کو مفہوم سمجھنے میں دشواری پیش نہ آئے۔

ترقی یافتہ اقوام دوسری اقوام کے علوم کو اپنے لوگوں کو تراجم کے ذریعے رسائی دیتی ہیں۔ ترجمے کے باعث ان کے ہاں علوم و فنون کی راہیں استوار اور ترقی کی راہیں دیگر اقوام کی نسبت تیز تر ہو جاتی ہیں۔ ان کے ہاں علم و ادب میں عصری شعور اور سماجی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ علم و ادب سے اخذ کردہ اسالیب ان کی تمدنی اور معاشرتی زندگی کو جلا بخشتا ہے۔ ترجمہ نگاری ایک نازک عمل ہے۔ اصل متن کے علمی شعور اور الفاظ کی پردہ پوشی کا مکمل ادراک اس کا زینہ اوّل ہے۔ کسی زبان کے الفاظ کا پس منظر حقیقی، لغوی معنی، اصطلاحی مفاہیم کا کامل شعور نہایت ضروری ہے۔ نزاکت لفظی کا شعور اور اس کو حقیقی پیرہن میں استعمال کرنا ضروری عمل ہے۔ بنیادی متن کی حقیقی رو کو اپنے علمی شعور میں جذب کر کے دوسری زبان میں اس طرح پیش کرنا کہ جمالیاتی سطح پر مجروح نہ ہونے پائے۔ یہ کام کٹھن ہے۔ بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ترجمہ نگاری آسان عمل ہے مگر یہ فن مشکل ترین ہے جو آدھے پونے کی بجائے پورے عالم اور بھرپور ترجمے کا متقاضی ہے۔ یہ محض دو زبانوں کے لفظوں کا ایک دوسرے میں ملبوس ہو کر پیش کرنے کا نام نہیں بلکہ ہر زبان کے اپنے نامانوس الفاظ ہوتے ہیں ان کا لب و لہجہ مخصوص ہوتا ہے۔ یہ اپنی زبان میں مخصوص سانچے سے پیکر ہوتے ہیں۔ ان سب کو کسی اور زبان کے حقیقی مزاج میں تبدیل کرنا اور اس کے لہجے سے ہم آمیز کرنا ایک تہذیبی تشکیل ہے۔ حتی الوسیع احتیاط کی جاتی ہے کہ دوسری زبان کے الفاظ مسخ نہ ہوں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق:

> "ایسا ترجمہ جس میں مترجم نے مصنف کی اصل روح کو پا کر اپنی زبان میں مزاج کے نگینے کی طرح بٹھا دیا ہو پھر ایک ایسا ہی گوہر نایاب ہے جیسے ادب کا کوئی شہ پارہ جو کبھی کبھی وجود میں آکر کسی تہذیب کی ساری روح کا مظہر بن جاتا ہے "(۱۱)

مصنف کا مزاج اور لب و لہجہ اس طرح کا ہو کہ اصل کا پرتو اس میں پایا جائے۔ مترجم کو اصل مصنف کا ہاتھ پوری علمی ذہانت اور اپنی زبان کی مہارت کے سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔ کبھی کبھی ایک لفظ، شعر یا جملے کو دوسری زبان میں منتقل کرنا اتنا بڑا معرکہ ہے کہ اگر وہ لفظ مستعمل ہو جائے تو زبان دوسری زبان کے الفاظ میں نہ صرف اضافہ ہوتا ہے بلکہ قابل ستائش بن جاتا ہے۔ انیس ناگی کے مطابق:

> "ترجمہ کرنے کیلئے ترجمے کی تھیوری کی موجودگی اور ٹارگٹ ہونا ضروری ہے کیونکہ یہی دو چیزیں ترجمہ کی قسمت کا فیصلہ کرتی ہیں۔ چنانچہ یہ تصور کہ ترجمے کا مقصد صرف ایک زبان سے دوسری زبان میں متن کو منتقل کرنا ہے، درست نہیں ہے۔ اس قسم کا ترجمہ ہمیں اخباروں کی خبروں یا جاسوسی ناولوں یا سستی رومانوی تحریروں میں ملتا ہے جہاں ترجمہ کی غرض و غایت، اطلاع دینا یا معلومات فراہم کرنا ہوتا ہے۔ ایسے تراجم کسی اسلوب کے حامل نہیں ہوتے۔ اگر مترجم حقیقی آہنگ اور زبان کا بنیادی مزاج شامل نہیں کرتا تو وہ بے کار کاوش ہے۔"(۱۲)

تراجم کے مسائل اس صورت میں کم ہو سکتے ہیں جب مترجم ایک زبان کے اندر کئی زبانوں کے راز سے واقفیت رکھتا ہو۔ کیونکہ مفہوم اور اشارے اسی وقت سمجھ میں آئیں گے جب وہ زبان دانی کا ماہر ہو گا۔ جو لوگ اس فن میں طاق نہیں ہوتے ان کا ترجمہ خامیوں سے مبرا نہیں ہوتا۔

انگریزوں کی برصغیر پاک و ہند میں آمد سے انگریزی زبان سے مقامی زبانوں میں تراجم کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا۔ ۱۸۰۰ء میں جب فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا تو ترجمہ کا منظم سلسلہ چل نکلا۔ اس کالج نے انگریزی سے اردو تراجم نہیں کیے بلکہ مقامی زبانوں کی مقبول کتب کو ترجمہ کے ذریعے منتقل کیا۔ عربی، فارسی، سنسکرت زبانوں کی معروف تصانیف کو اردو میں منتقل کیا گیا۔

ترجمہ کی روایت اور فروغ کے حوالے سے سرسید کی تحریک بھی اہمیت کی حامل ہے۔ سرسید کی قائم کردہ "سائینٹیفک سوسائٹی" نے ترجمے کے حوالے سے اہم کردار ادا کیا۔ انفرادی سطح پر بھی ترجمے کا فن بام عروج پر پہنچا۔ عصر حاضر کے اہم ترجمہ نگاروں میں محمد عمر میمن، اشفاق احمد، حسن عسکری، شان الحق حقی، انتظار حسین اور ڈاکٹر جمیل جالبی زیادہ معروف ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے جارج آرول کے ناول Animal Farm کا ترجمہ "جانورستان" کے عنوان سے کیا ہے۔ مذکورہ ناول پہلی مرتبہ ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔ مگر ڈاکٹر جمیل جالبی کا ترجمہ شدہ پہلا ایڈیشن ۲۰۰۷ء میں منظر عام پر آیا۔ جارج آرول کا یہ ناول علامتی پیرائے میں روسی نظام حکومت پر طنز کرتا ہے۔ جس طرح روسی جاگیرداری نظام میں مزدوروں کے حقوق سلب کر لیے گئے اسی طرح مذکورہ ناول میں Animal Farm کا مالک مسٹر جونز جانوروں سے بدتر سلوک کرتا ہے۔ مسٹر جونز پرلے درجے کا شراب نوش ہے۔ جسے کئی کئی دن تک ہوش نہیں آتا۔ اس اثناء میں بعض جانور بھوکے پیاسے رہ جاتے ہیں۔ ان جانوروں میں بوڑھا میجر یعنی بوڑھا سور، سنوبال، نپولین، کلوور، میوریل، بنجمن، مولی، موسس، اور بوکسر شامل ہیں۔ بوڑھا میجر ایک دن تمام جانوروں کو جمع کرتا ہے اور مسٹر جونز کے ناروا سلوک کا کچا چٹھا کھول کر سامنے رکھ دیتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ انہیں بغاوت پر بھی اکساتا ہے۔ چنانچہ اسی کے ایماء پر جانورستان کے سارے جانور ایک دن اپنے مالک مسٹر جونز کو مینر فارم سے بے دخل کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد دو سور یعنی نپولین اور سنوبال جانورستان کے حاکم بن جاتے ہیں۔ حالانکہ سب جانوروں میں یہ بات طے پاتی ہے کہ وہ سب مل جل کر رہیں گے۔ وہ نہ تو شراب پیئیں گے اور نہ ہی بستر پر سوئیں گے۔ علاوہ ازیں ایک فرمان جاری ہوتا ہے جس پر پانچ اور شرائط درج ہوتی ہیں۔ نپولین ایک دن جانورستان کے جانوروں کو ساتھ ملا لیتا ہے اور دوسرے سور یعنی سنوبال کو باہر کی راہ دکھاتا ہے۔ اب جانورستان میں صرف نپولین ہی کا حکم چلتا ہے۔ نپولین اپنے ساتھی جانوروں کے ساتھ مل کر پن چکی تیار کرتا ہے۔ مگر یہ پن چکی مسٹر جونز کی یورش سے ختم ہو جاتی ہے۔ آخر کار دوسری مرتبہ پن چکی بن جاتی ہے۔ جارج آرول نے نپولین کے کردار کو ہدف تنقید بنایا کیونکہ وہ تمام وعدے فراموش کر دیتا ہے۔ اس کے اسی رویے سے جانور عاجز آ جاتے ہیں۔ آخر کار ایک دن وہ جانور بھی بغاوت پر اتر آتے ہیں اور نپولین کے اقتدار کا سورج جلد ہی غروب ہو جاتا ہے۔ جہاں تک ناول کے ترجمے کا تعلق ہے تو ڈاکٹر جمیل جالبی نے اسے تخلیقی ترجمہ بنا دیا ہے۔ کیونکہ ایک مصور کی طرح وہ اسے ایک شاہکار کے درجے تک لے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ ترجمہ مصنف کے لہجے کی کھنک سے لبریز نظر آتا ہے۔ جس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

> “Mr.Johns, of the Manor Farm, had locked the hen-houses for the night, but was too drunk to remember to shut the pop holes with the ring of light from his lantern dancing from side to side, he lurched across the yard, kicked off his boots at the back door, drew himself a last glass of beer from the barrel in the Scullery, and made his way up to bed, where Mrs. Jones was already snoring.”(۱۳)

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.5 No.2 2022

"مینر فارم کے مالک مسٹر جونز نے رات کے وقت مرغیوں کو ڈربے میں بند کیا۔ وہ شراب کے نشہ میں دُھت ڈربے کی چٹخنی لگانا بھول گیا۔ لڑکھڑاتے قدموں میں اس نے صحن کو پار کیا۔ اس کی لالٹین سے روشنی کے حلقے ناچ رہے تھے۔ پچھلے دروازے پر اس نے اپنے جوتوں کو پٹخا۔ پیپے میں سے بیئر کا آخری گلاس چڑھایا اور بستر کی طرف بڑھا جہاں مسز جونز پہلے سے خراٹے لے رہی تھیں۔"(۱۴)

انگریزی سے ترجمہ میں سب سے بڑی قباحت طویل جملوں کے ساتھ پیش آتی ہے۔ مگر ڈاکٹر جمیل جالبی نے انگریزی کے طویل فقروں کو چھوٹے چھوٹے فقروں میں تقسیم کر دیا ہے۔ جس سے اصل عبارت کا حسن زائل نہیں ہوا۔ جملے کی طوالت قارئین کے لیے بوجھل اور گراں ثابت ہوتی ہے۔ مگر مترجم کا کمال اسی بات میں پوشیدہ ہے کہ اس نے حروفِ عطف کے بغیر ہی پیرا گراف کو یوں چھوٹے چھوٹے جملوں میں ڈھال دیا ہے کہ عبارت میں شرینی اور جاذبیت پیدا ہو گئی ہے۔ مزید براں انگریزی زبان کے پیچیدہ جملے کو عام فہم زبان میں ڈھالنا جوئے شیر لانے کے مترادف تصور کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے نہ صرف جملوں کے سلسلے میں اختصار پسندی سے کام لیا بلکہ کہ اس ضمن میں سلاست اور روانی کو بھی مدِ نظر رکھا ہے۔ جس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

"June came and the hay was almost ready for cutting. On mid summer's eve, which was a Saturday, Mr.Jones went into the willingdon and got so drunk at the red lion that he did not come back till midday on Sunday. The men had milk the cows in the early morning and then had gone out rabbiting without bothring to feed the animals. When Mr.Jones got back he immediately went to sleep on the drawing room sofa with the news of the world over his face, so that when evening came, the animals were still unfed."(۱۵)

"جون کا مہینہ آ پہنچا۔ گھاس سوکھ کر تیار ہو گئی۔ گرمیاں آدھی گزر چکی تھیں۔ ہفتہ کا دن تھا۔ جون شراب خانہ میں گیا اور خوب شراب پی۔ نشہ میں دُھت وہ وہیں زمین پر گر پڑا۔ اتوار کے دن جب خمار اترا تو وہ گھر پہنچا۔ اس کے آدمیوں نے علی الصبح گایوں کا دودھ نکالا اور خرگوش کے شکار کو نکل کھڑے ہوئے۔ اس عرصہ میں جانوروں کو کچھ کھانے پینے کو نہیں ملا۔ وہ بھوک سے دیوانے ہو گئے۔ جونز جب واپس آیا تو وہ اپنے صوفے پر گر پڑا۔ کئی وقت کا جاگا ہوا تھا۔ اخبار کو اپنے منہ پر ڈھک کر فوراً خراٹے لینے لگا، شام ہو گئی۔ اور اس دن بھی جانوروں کو کچھ کھانے کو نہ ملا۔"(۱۶)

ڈاکٹر جمیل جالبی کا ترجمہ بیک وقت متن کے تابع بھی ہے اور اس سے آزاد بھی وہ نہ صرف خیال اور مفہوم کو اور اس کے باریک سے باریک پیچ و خم کو ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اصل عبارت کے الفاظ ہی نہیں بلکہ اس کے بین السطور کو بھی پڑھتے ہیں تو اس کی مدد سے حاصل عبارت کا ترجمہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دراصل ترجمے میں مصنف کے خیالات کی پابندی تو ضروری ہوتی ہے۔ اس کے الفاظ و محاورات اور اس کے اسلوب بیان کی تقلید فرض نہیں ہوتی۔ اگر ان باتوں کی پابندی ضروری ہوتی تو ترجمے کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی۔ اصل تصنیف پر ہی انحصار کرنا بہتر تھا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی مصنف کے خیالات کو اول سمجھا ہے۔ یعنی ترجمے کے دوران خیالات ہی کو مدِ نظر رکھا ہے۔ جس کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔

1. Whatever goes upon two legs is an enemy
2. Whatever goes upon four legs, or has wings, is a friend.
3. No animal shall wear clothes.
4. No animal shall sleep in a bed.
5. No animal shall drink alcohol.
6. No animal shall kill any other animal.
7. All animals are equal. (۱۷)

۱۔ وہ جو دو ٹانگوں پر چلتا ہے دشمن ہے۔

۲۔ وہ جو چار ٹانگوں پر چلتا ہے یا پر رکھتا ہے دوست ہے۔

۳۔ کوئی جانور کپڑے نہیں پہنے گا۔

۴۔ کوئی جانور بستر پر نہیں سوئے گا۔

۵۔ کوئی جانور شراب نہیں پیئے گا۔

۶۔ کوئی جانور دوسرے جانور کو نہیں مارے گا۔

۷۔ سب جانور برابر ہیں۔ (۱۸)

سائنسی، علمی اور فلسفہ کی کتابوں کا ترجمہ کرنے کے لیے پھونک پھونک کر قدم رکھا جاتا ہے۔ مگر جہاں بات ادبی ترجمہ کی آ جائے تو ترجمہ اس سلسلے میں آزاد ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اول الذکر مضامین کے تراجم میں الفاظ و تراکیب کا ترجمہ مشکل بن جاتا ہے۔ اس ترجمے میں تصرف کا عمل کسی بھی صورت میں رونما نہیں ہو سکتا۔ مگر ادبی ترجمے میں مترجم تصرف کی بدولت ترجمے میں عمدگی پیدا کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے ترجمے میں تصرف کی مثالیں بھی جا بجا نظر آتی ہیں۔ ترجمہ چونکہ مشکل فن ہے اس لیے اگر اس میں تصرف کی گنجائش پیدا کرنی پڑ جائے تو یہ ہرگز نہیں کر سکتا۔ کیونکہ

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.5 No.2 2022

اس کے لئے بھی دونوں زبانوں کاماہر ہوناپڑتا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی میں یہ صلاحیت پوری طرح موجود ہے۔وہ انگریزی زبان پر عبور رکھتے ہیں۔لہذا جہاں جہاں ترجمے میں تصرف کی ضرورت پڑتی ہے وہ اپنی زبان کے ذریعے ترجمے کواس درجے پر پہنچادیتے ہیں کہ اصل اور نقل کی تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔اس حوالے سے ایک مثال ملاحظہ ہو:

> "It was a bitter winter. The Stormy weather was followed by sleet and snow, and then by a hard Frost did not break till well into February. The animals carried on as best they could with the rebuilding of the windmill, well knowing that the outside world was watching them and that the invias human beings would rejoice and triumph if the mill were not finished on time."(١٩)

> "اس سال کڑاکے کی سردی پڑی۔موسم طوفانی رہا اور برف و باراں کی کثرت رہی، شدید پالے نے اتنا طول کھینچا کہ فروری کا مہینہ آگیا۔جانور اپنی پوری کوششوں کے ساتھ پون چکی کی تعمیر میں لگے رہے۔انہیں ہر وقت یہ دھڑ کا لگا رہتا کہ حاسد انسان کی ہر وقت ان پر نظر ہے۔اور اگر پون چکی کی تعمیر وقت پر ختم نہ ہو سکی تو وہ بہت خوش اور بہت مسرور ہو گا۔"(٢٠)

ترجمے کے دوران مصنف کے لیے سب سے مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب کردار کوئی حرکت کر رہے ہوں۔یعنی ان کی زبان کی ادائیگی کو ایسے ڈھنگ سے بیان کیا جاتا ہے تاکہ یہی نظر آئے کہ یہ اصل کتاب ہے۔علاوہ ازیں مقامی لب ولہجہ بھی اس سلسلے میں سب سے اہم گردانا جاتا ہے کیونکہ ایک زبان کے اندر کئی زبانیں ہوتی ہیں اور زبانوں کا اطلاق صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو ترجمے کے فن سے پوری طرح آگاہ ہوتا ہے۔کرداروں کا لب ولہجہ اور حرکات و سکنات کو واضح کرنے میں مترجم کو بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔یعنی اس نے جس کردار کو متعارف کروانا ہوتا ہے اس کی گفتگو اور حرکات و سکنات کو حقیقت سے نزدیک تر کرنا پڑتا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی کے ترجمے میں یہ خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔نپولین کی گفتگو اور حرکات و سکنات ان کی زبانی ملاحظہ ہو:

> "Napoleon stood sternly serveying his audience; he uttered a high-pitched whimper. Immediately the dogs bounded forward, seized four of the pigs by the ear and dragged them, squealing with pain and Terror, to Napoleon's feet. The big's ears were bleeding, the dogs had tasted blood, and for a few moments they appeared to quie mad."(٢١)

> "نپولین کھڑا ہوا۔سامعین پر گہری نظر ڈالی۔منہ بسورا اور خاص قسم کی ریں ریں کی آواز نکالی۔کتے فوراً آگے بڑھے اور چار سوروں کو کان سے پکڑے ہوئے نپولین کے قدموں پر لا کر ڈال دیا۔سوروں کے کانوں سے خون بہہ رہا تھا۔کتوں نے خون کا ذائقہ چکھ لیا تھا اور تھوڑی دیر کیلئے وہ پاگل سے ہو گئے۔"(٢٢)

اردو ترجمہ میں جہاں مترجم آزاد ہوتا ہے وہاں اس کے لئے یہ بھی چیلنج بن جاتا ہے کہ وہ ادبی تراکیب اور محاوروں کے ترجموں کے لیے کس طرح کے الفاظ سامنے لائے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس سلسلے میں بھی زیادہ تر ان محاوروں کو ترجیح دی ہے جو معروف ہونے کے باوجود مقامی رنگ کو واضح کرتے ہیں۔انہوں نے کھلبلی مچ جانا(ص ۷)، پھولے نہ سمانا(ص ۲۱)، دھڑ کا لگنا(ص ۶۲)، موت کے گھاٹ اتارنا(ص ۷۱)، افراتفری پھیلنا(۷۲)، اور آنکھیں ڈب ڈبانا جیسے آسان محاورات کی بدولت ترجمے میں برجستگی پیدا کر دی ہے۔مترجم کے لیے زبان کی سادگی سب سے اہم شرط مانی جاتی ہے۔اگر زبان مشکل استعمال ہو گی تو ترجمے کی بدولت قارئین دوسری تہذیب سے واقفیت حاصل نہیں کر سکیں گے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے جانورستان کے ترجمے میں ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو عام، فہم اور آسان ہیں۔اس حوالے سے ایک مثال ملاحظہ ہو۔

> "Throughout the year the animals worked even harder than they had worked in the previous year to rebuild the windmill, with belt wall twice as thick as before, and to finish it by the appointed date, together with the regular work of the farm, was a tremendous labour."(٢٣)

> "تمام سال جانوروں نے پچھلے سال سے کہیں زیادہ محنت و مشقت کی۔پون چکی کی تعمیرِ نو کی اور وہ بھی پہلے سے دگنی موٹی دیواروں کے ساتھ اور پھر اسے مقررہ وقت پر ختم کرنا، باڑہ کے روزانہ کے کام کے ساتھ بہت مشقت کا کام تھا۔"(٢٤)

ایک اچھا ترجمہ صرف وہی شخص کر سکتا ہے جسے ذاتی دلچسپی ہو۔ڈاکٹر جمیل جالبی کے تراجم اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں کہ انھیں اس فن سے خصوصی لگاؤ ہے۔اس لئے ان کے تراجم میں ہمیں وہ باتیں نظر آتی ہیں جو اصل تصنیف میں موجود ہوتی ہیں۔ترجمے میں قدم قدم پر پابندی کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر ڈاکٹر جمیل جالبی نے اصل مفہوم کو اس طرح سمو دیا ہے کہ اصل مصنف کے اسلوب کی جھلک نظر آتی ہے۔اگر اسلوب میں چاشنی پیدا نہ کی جائے تو وہ ترجمہ بوریت کا شکار ہو جاتا ہے۔اس لیے ڈاکٹر جمیل جالبی اسلوب کے سلسلے میں بڑی احتیاط برتی ہے۔یعنی اسے جاندار بنا دیا ہے۔جس کی ایک مثال یہاں ملاحظہ ہو:

> "Twelve voices were shouting in anger, and they were all alike. No question, now, what had happened to the faces of the pigs? The creatures

outside looked from pig to man, and from man to pig, and from pig to man again; but already it was impossible to say which was which.”(۲۵)

"بارہ آوازیں غصے میں چلا رہی تھیں اور وہ سب کی سب ایک جیسی تھیں۔اب یہ سوال ہی نہ رہا تھا کہ سوروں کے چہروں کو کیا ہو گیا تھا۔ باہر کے جانوروں نے سوروں سے انسانوں کو،انسانوں سے سوروں کو اور پھر سوروں سے انسانوں کو دیکھا لیکن اب ان میں کسی قسم کی تمیز کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔"(۲۶)

ڈاکٹر جمیل جالبی کا یہ ترجمہ دیگر تراجم سے بہتر اور معیاری ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ یہاں وہ آزادی کے ساتھ خیالی تصویر کشی کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں اور تصرف سے ترجمے میں رونق بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ مذکورہ ترجمہ تخلیقی ترجمے کے ذیل میں آتا ہے تو غلط نہ ہو گا۔

حوالہ جات

۱۔ دہلوی، سرسید، مرتب،"فرہنگ آصفیہ" جلد اول، لاہور، الفیصل ناشران وتاجران، ۲۰۱۹ء، ص ۴۷

۲۔ نیئر، نورالحسن، مولوی، مرتب، "نوراللغات"، جلد اول، اسلام آباد، نیشنل بُک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۶ء، ص ۱۰۳۲

۳۔ وارث سرہندی، مرتب، "علمی اردو لغت"، لاہور، علمی کتاب خانہ، ۲۰۲۱ء، ص ۴۴۳

۴۔ The Penguin Dictionary of Literary Terms and Literay Theory, J.A Cuddon, London: Pengiun book,1991, p.994

۵۔ احمد فخری، حاجی، دور تراجم، مضمون، مشمولہ، "تراجم کے مباحث"، مرتب، محمد ابو بکر فاروقی، کراچی، سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۱۶ء، ص ۷۹

۶۔ رابعہ سرفراز، ڈاکٹر، "ترجمہ: فن اور اہمیت"، اسلام آباد، ہائر ایجوکیشن کمیشن، ۲۰۱۱ء، ص ۱۸

۷۔ ایضاً، ص ۲۴

۸۔ جیلانی کامران، پروفیسر، ترجمے کی ضرورت، مضمون، مشمولہ، "ترجمہ: روایت اور فن"، مرتب، نثار احمد قریشی، محمد شریف کنجاہی (نظر ثانی)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء، ص ۲۲۵، ۲۲۴

۹۔ شہباز حسین، "ترجمہ کی اہمیت"، مضمون، مشمولہ، "ترجمہ کا فن اور روایت"، مرتب، ڈاکٹر قمر رئیس، لاہور، پیس پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء، ص ۱۸۱

۱۰۔ خالد اقبال، "ترجمہ کی اہمیت"، مضمون، مشمولہ، "تراجم کے مباحث"، مرتب، محمد ابو بکر فاروقی، کراچی، سٹی بُک، ۲۰۱۶ء، ص ۶۴

۱۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، "ترجمے کے مسائل"، مضمون، مشمولہ، "ترجمہ کا فن اور روایت"، مرتب، ڈاکٹر قمر رئیس، لاہور، پیس پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء، ص ۱۰۷

۱۲۔ انیس ناگی، ڈاکٹر، "ترجمے کا فن"، تشکیلات، جمالیات، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۲۵۹

۱۳۔ George Orwell, Animal Farm, London: Penguin Books, 2001, P. 1

۱۴۔ جمیل جالبی، "جانورستان"، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۷ء، ص ۷

۱۵۔ George Orwell, Animal Farm, London: Penguin Books, 2001, P. 9-10

۱۶۔ جمیل جالبی، "جانورستان"، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۷ء، ص ۲۰

۱۷۔ George Orwell, Animal Farm, London: Penguin Books, 2001, P.13

۱۸۔ جمیل جالبی، "جانورستان"، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۷ء، ص ۲۵

۱۹۔ George Orwell, Animal Farm, London: Penguin Books, 2001, P.37

۲۰۔ جمیل جالبی، "جانورستان"، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۷ء، ص ۶۲

۲۱۔ George Orwell, Animal Farm, London: Penguin Books, 2001, P.42

۲۲۔ جمیل جالبی، "جانورستان"، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۷ء، ص ۶۹

۲۳۔ George Orwell, Animal Farm, London: Penguin Books, 2001, P.45-46

۲۴۔ جمیل جالبی، "جانورستان"، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۷ء، ص ۷۲۔۷۱

۲۵۔ George Orwell, Animal Farm, London: Penguin Books, 2001, P.71

۲۶۔ جمیل جالبی، "جانورستان"، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۷ء، ص ۱۱۲